Tarseel, Vol. 17 (ISSN: 0975-6655)
A Peer Reviewed Research Journal of Urdu
(Listed in UGC-CARE)
Directorate of Distance Education
University of Kashmir

مہاراشٹر کے معاصر نظم نگار

ڈاکٹر شیخ احرار احمد

تلخیص

اردو ادب کی ترویج میں شہر ممبئی کے ناقابل فراموش کردار سے کوئی منکر نہیں ہوسکتا ہے۔ یہاں اردو کی شعری روایت کے نمونے پانچویں صدی عیسوی سے ہی دیکھنے کو ملتے ہیں۔ یہاں کے شعرا حضرات نے نظم کی مختلف اصناف کو اپنے اظہارِ خیالات کا ذریعہ بنالیا ہے۔ یوں یہاں نظم، غزل، مثنوی، مرثیہ اور رباعی کے علاوہ دوسری اصناف شعر کی تاریخ بھی قدرے مستحکم و مضبوط ہے۔ معاصر دور میں بھی یہاں کی ادبی روایت بڑی زرخیز اور سرسبز و شاداب ہے۔ دیگر اصناف سے قطع نظر نظم نگاری کی موجودہ صورت حال ہندوستان کیا دنیا کے دوسرے خطوں سے کسی بھی صورت کم وقیع نہیں ہے۔ اس دعوے کو عملی طور پر حقیقی ثابت کرنے کے سلسلے میں یہ تحقیقی و تنقیدی مقالہ ایک اہم دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس مقالے کے مطالعے سے یقینی طور پر قارئین کرام مہاراشٹر میں نظمیہ شاعری کی روایت کی موجودہ صورت حال سے بھرپور واقفیت حاصل کرسکیں گے۔

کلیدی الفاظ:

شعلہ حنا، کرب تنہائی، مصائب زمانہ، جنسی ناآسودگی، غم روزگار، جدیدیت، احتجاجی لب ولہجہ، صنعتی شہر

بیسویں صدی میں اردو نظم نگاری کے بڑھتے رجحان کا اثر مہاراشٹر کے شعرا نے بھی قبول کیا۔ پانچویں دہائی کے

درمیان ممبئی ترقی پسند شاعروں کا مرکز بنا اور اسی زمانے سے مہاراشٹر میں اردو نظموں کا نیا دور شروع ہوتا ہے۔ سردار جعفری، کیفی اعظمی، جاں نثار اختر، ساحر لدھیانوی، اختر الایمان اور سکندر علی وجد جیسے شعرا کے بعد مہاراشٹر میں اردو نظم نگاروں کی جو نئی نسل سامنے آئی وہ ترقی پسند، جدیدیت اور مابعد جدیدیت کے نظریے کے تحت حالات سے نبرد آزما رہی۔ یہ نئے نظم نگار اپنے احساسات اور درد و غم کا اظہار نظم کی صنف میں کرتے رہے۔ کسی کا غم ذاتی تو کسی کا آفاقی، کوئی غمِ روزگار سے پریشان تو کوئی معاشرے کا ستم جھیل رہا ہے، کوئی عشق میں تباہ تو کوئی پردیس میں وطن کی یادوں کے سہارے دن کاٹ رہا ہے۔ غرض کہ، سیاسی، سماجی اور معاشی، سبھی طرح کے حالات سے یہ ملک اس وقت جو جھ رہا تھا جس کا عکس یہاں کے نظم نگاروں کی نگارشات میں خوب جھلکتا ہے۔ مہاراشٹر کے تمام معاصر نظم نگاروں کی تفصیلات یہاں پیش کرنا ممکن نہیں لہٰذا صرف ان ہم عصر نظم نگاروں اور ان کی نظموں کے تعلق سے بات کی جائے گی جن کا شمار طرزِ اظہار کی وجہ سے مہاراشٹر کے نمائندہ نظم نگاروں میں ہوتا ہے۔

کالی داس گپتا رضا ۱۹۲۵ء تا ۲۰۰۱ء

گپتا رضا کے شعری مجوعے '' شعلۂ خاموش'' ۱۹۶۸ء، ''شورشِ پنہاں'' ۱۹۷۰ء، ''شاخِ گل'' ۱۹۷۴ء، ''اجالے'' (نعت و منقبت کا مجموعہ) ۱۹۷۵ء، ''شعاعِ جاوید'' (رباعیات کا مجموعہ) ۱۹۸۰ء، ''نظم سمندر'' (کچھ غیر مطبوعہ اور بقیہ مجموعوں سے انتخاب) ۱۹۹۶ء میں کل ملا کر ۱۴۸ نظمیں ہیں۔ رضا کی نظموں کو عبداللہ کمال نے تین ادوار میں تقسیم کیا ہے جس کی ابتدا ۱۹۴۵ء سے ہے۔ آخری دور کی نظموں کو نئی ''واضح جہت کی تعین کاری'' کا دور کہا ہے۔ اس دور کی نظموں کا تعلق ممبئی میں ان کے قیام سے شروع ہوتا ہے۔ گپتا رضا بحیثیت محققِ غالب مشہور ہیں، لیکن ان کی شاعری پر اقبال اور ٹیگور کا اثر جھلکتا ہے۔ ان کے یہاں کوئی غم ذاتی نہیں بلکہ پورے ہندوستانی عوام کا غم ہے جس کا مداوا بے تعصبی، اخوت و مساوات اور علم و عمل میں تلاش کرتے ہیں۔ نظم ''لاشعور سے شعور تک'' میں زیست اور موت کے فلسفے کے ذریعہ یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ موت ہی اصل ہستی ہے۔ نظم ''رقص'' ایک علامتی نظم ہے جس میں انسانی رعونت کے رقص پر فلسفیانہ روشنی ڈالی گئی ہے۔ نظم ''آخری لمحے'' میں وہ منظر پیش کیا گیا ہے جب انسان زندگی کے آخری لمحوں میں اپنے اچھے برے اعمال کو یاد کرتا ہے۔ نظم ''اندھیرا'' میں دونوں قوموں کو فساد کش مشورہ دے رہے ہیں۔ نظم ''دکھی نہ ہو''، ''دیوار''، ''گھٹن''، ''لہو کا لالہ زار'' اور ''شعور'' میں اخوت و بھائی چارے، تعصب کی گھٹن سے نجات اور اہنسا کا پیغام دے رہے ہیں۔ نظم ''شعور'' کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں:

محبت بھی ہے کمزوری بشر کی وفا بھی ہے غرض مندوں کا شیوہ

سیاست دور حاضر کی ترقی شجاعت آدمیت کا فریضہ
چمن کا رنگ سر رشتہ نظر کا اسے حسنِ حقیقی سے نہ جوڑو
جھکی ڈالی سے کلیاں توڑنا کیا کوئی زنداں کوئی زنجیر توڑو

گپتار ضاؔ کی نظموں کا کمال یہ ہے کہ ملکی اور سماجی مسائل کو شگفتگی اور نرمی کے ذریعہ فلسفیانہ انداز میں اس طرح بیان کرتے ہیں کہ وہ قاری کو اپنا غم محسوس ہونے لگتا ہے۔ وہ زخموں کو کریدنے کے بجائے مرہم رکھتے اور درد کا مداوا تلاش کرتے ہیں۔ اس طرح کہا جا سکتا ہے کہ گپتار ضاؔ کی بیشتر نظمیں پیامی ہیں۔ انداز روایت سے ہم آہنگ ہے لیکن استعارے اور علامتیں دور حاضر سے اخذ کرتے ہیں اسی لیے ان کی نظمیں نئی فضا میں تازگی کا احساس لیے ہوئے ہیں۔

قیصرؔ الجعفری، ۱۹۲۶ء تا ۲۰۰۵ء

ان کے چھ شعری مجموعے بالترتیب اس طرح ہیں، ''رنگِ حنا'' ۱۹۶۴ء، ''نبوت کے چراغ'' (نعتیہ) ۱۹۶۴ء، ''سنگِ آشنا'' ۱۹۷۷ء، ''دشتِ بے تمنا'' (غزلوں کا مجموعہ) ۱۹۸۷ء، ''چراغِ حرا'' (منظوم سیرتِ نبوی) ۱۹۹۷ء، اور ''اگر دریا ملا ہوتا'' ۲۰۰۵ء۔ کل ۳۴ نظمیں ہیں۔ قیصرؔ الجعفری کی نظموں میں گاؤں کی اور اپنے ان عزیزوں کی یاد بھی شامل ہے جو ہجرت کر کے پاکستان چلے گئے۔ علاوہ ازیں ممبئی شہر کی رونقیں، یہاں کے روسا کے عیش کے درمیان کسی فرد مفلس کی تمنائیں بھی نظر آتی ہیں۔ وہ پردیسی بھی ہے جس کی تنخواہ اپنے حق داروں کی بنیادی ضرورتوں کو پوری کرنے کے لیے ناکافی ہے۔ ان موضوعات پر ''شہرِ غزالاں''، ''شعلۂ حنا''، ''صلیب''، ''کھویا ہوا گاؤں'' اور ''پچھتاوا'' وغیرہ اہم نظمیں ہیں۔ نظم ''یہ وہ بستی ہی نہیں'' انسانی بے حسی کی عمدہ مثال ہے۔ نظم ''کھول دیں بند دریچے'' پاکستانی دوستوں کے نام اخوت و آشتی کا باہمی پیغام ہے۔ نئی صدی پر امن و سلامتی کی تمنا کرنا، گزری صدی کی تباہ حالی کا ذکر اور فرقہ پرستوں کو تنبیہ جیسے موضوع پر ''والعصر''، ''آخری صدی کے موڑ پر'' اور ''حریفِ جاں سے کہو'' وغیرہ اہم نظمیں ہیں۔ حالات کی ستم ظریفی کہ ایک ماہ میں جہاں صرف دس دن کام ملے، شاعر اپنی بیوی کو لکھتا ہے: (نظم ''صلیب'')

غموں کی دھوپ میں کمھلا گیا جمال ترا وفورِ شرم سے رخ پر مرے پسینہ ہے
میں ہر مہینے تجھے خرچ کس طرح بھیجوں یہاں تو تین مہینوں کا اک مہینہ ہے

نظامِ زر میں غریبوں کو اختیار نہیں کہ جسم و جاں کی تباہی پہ آہ بھی کرلیں
میں وہ صلیب ہوں جس پر تری تمنائیں جو کوئی راہ نہ پائیں تو خود کشی کرلیں

نظم ''اجنبی لمحے''، ''سادگی'' اور ''کھنڈر'' عشقیہ موضوع پر ہیں۔ نظم ''کال'' ملک کی تباہ حالی کا المیہ ہے۔ ''نیا خون'' انقلابی نظم ہے جو سایۂ دار میں بیباک سجدے کے لیے ہم وطنوں کو للکار رہی ہے۔ نظم ''خون کے پھول'' محاذِ جنگ کے درمیان سرحد پر عید منانے والے فوجی بھائیوں کو خراجِ تحسین پیش کرتی ہے۔ ان کی ایک اہم نظم ''ہم انتظار میں ہیں'' جس میں سہاگنیں اپنے فوجی شوہروں کو دشمنوں پر فتح یاب ہونے کا پیغام دے رہی ہیں۔ نمونہ ملاحظہ فرمائیں:

یہ سرخ جنگ جو برپا ہوئی ہے سرحد پر یہ تیز آگ جو پھیلی ہے کوہساروں میں
زیادہ روزنہ چھڑکے گی وادیوں میں لہو زیادہ دیر نہ ٹھہرے گی لا لہ زاروں میں
بڑے غرور سے آئے ہیں دشمنانِ وطن انھیں بہادو انہی کے لہو کے دھاروں میں
دعائیں دیں گے تمہارے بدن کے زخموں کو کھلیں گے پھول جو اگلے برس بہاروں میں
ہماری فکر نہ کرنا کہ ہم اداس نہیں وطن کے نام پہ جی لیں گے خارزاروں میں
وہ اس حسین جدائی کا لطف کیا جانیں ہمیں جو لوگ سمجھتے ہیں سوگواروں میں
تمہیں قسم جو ہمارا سہاگ یا د آئے محاذِ جنگ پہ، تلوار کے حصاروں میں
کب آرہے ہو لکھو فتح کا نشاں لے کر ہم انتظار میں ہیں نذرِ جسم و جاں لے کر

قیصر الجعفری کی نظمیں (ایک دو کے علاوہ) سبھی روایتی ہیئتوں میں ہیں اور پرتاثر بھی، ان کے یہاں غمِ ذات کا اظہار تو ہے لیکن ان کے ہم عصروں کی طرح صرف تنہائی اور ذات میں گم ہوکر رونا اور حالات کا نوحہ نہیں ملتا بلکہ سردار جعفری کے الفاظ میں ''ان میں غمِ ذات بھی ہے اور غمِ کائنات بھی''۲۔ قیصر الجعفری کی نظموں کی خوبی یہ ہے کہ ان پر زمانے کی گرد نہیں پڑ سکتی۔ وہ ہر دور میں تر و تازہ محسوس ہوں گی۔

قاضی سلیم، ۱۹۲۷ء تا ۲۰۰۴ء

ان کے شعری مجموعے ''نجات سے پہلے'' ۱۹۷۱ء، ''ریگزاروں کے گیت'' (انگریزی نظموں کے منظوم ترجمے) ۱۹۸۶ء، ''مثنوی باغبان وگل فروش'' ۱۹۸۷ء اور ''رُستگاری'' ۲۰۰۵ء ہیں۔ قاضی سلیم کی کئی نظمیں نصاب میں شامل ہیں۔ انھوں نے جدید استعاروں اور علامتوں سے اپنی بیشتر نظموں کو معمہ بنا دیا ہے جہاں تک قاری کی رسائی مشکل نظر آتی ہے۔ شمس الرحمٰن فاروقی کا یہ قول بہت حد تک درست ہے کہ:

> ''قاضی سلیم کے یہاں کبھی کبھی اور شروع کی نظموں میں زیادہ تر یہ احساس نمایاں رہتا ہے کہ ان نظموں کا قاری یا سامع کوئی شخص ہے ضرور لیکن وہ کون ہوسکتا ہے، یہ بات صاف نہیں ہوتی۔''[۱]

قاضی سلیم کو عظمت اللہ خاں کی تحریروں سے تحریک ملی، انگریزی کے مطالعے اور ن م۔ راشد کے مجموعے ''ماورا'' نے انھیں جدیدیت کی طرف راغب کیا۔ ان کے شعری اسلوب اور لسانی ڈھانچوں کے بارے میں فضیل جعفری کا خیال ہے کہ:

> ''لسانی سطح پر جو چیز سب سے پہلے ہمیں متوجہ کرتی ہے وہ ان کی نظموں کی پیچیدہ بافت ہے۔ بسا اوقات ان کی نظموں کی کئی قرات کے بعد بھی معنی کے امکانات پوری طرح روشن نہیں ہو پاتے۔ کبھی کبھی وہ اپنے خیالات کا اظہار اس درجہ نجی سطح پر کرتے ہیں کہ قاری خاصہ کنفیوز ہوجاتا ہے۔''[۲]

لیکن جہاں قاری معنی اور مفہوم تک رسائی حاصل کر لیتا ہے وہاں اسے نئی حسیت اور تازگی کا احساس بھی ہوتا ہے۔ ایسی نظمیں قاری کے ذہن پر دیرپا اثر چھوڑتی ہیں۔ جن میں سے ''دھرتی تیرا مجھ سا روپ''، ''مکتی''، ''ایک نظم''، ''لمس''، ''یاد'' اور ''بے نظر میری آنکھیں'' وغیرہ جیسی کئی نظمیں ہیں جو قاری پر دیرپا اثر چھوڑتی ہیں۔ مثال دیکھیں:

نظم ''دھرتی تیرا مجھ سا روپ''

دھرتی تیرا مجھ سا روپ / چاہے چھاؤں ہو چاہے دھوپ / اندھے گہرے
کھڈ، پاتال / سینا چھلنی روح نڈھال / باہر ٹھنڈک اندر آگ / دل میں
درد، زباں پر راگ / دھرتی تیرا مجھ سا روپ / تیری صدیاں میرے پل /
وہی قیامت وہی اجل / تیری مٹی میرا خمیر / تیرا خدا اور میرا ضمیر / دھرتی تیرا
مجھ سا روپ / بیج اگے یا قبر بنے / پھول کھلیں یا راکھ اڑے / میری طرح

چپ چاپ رہے /میری طرح ہر درد سہے /دھرتی تیرا مجھ سا روپ /چاہے
چھاؤں ہو چاہے دھوپ

نظم ''ایک نظم''

جب میں نے تمہارا جسم چھوا /میرے اندر کوئی اور تھا جس نے اور کسی کا جسم چھوا /
اوروں کی بیتاب چھون میں /پھر مجھ جیسا /پھر تم جیسا /کوئی اور تھا جس نے کسی کا
جسم چھوا

قاضی سلیم نے کبھی کوئی غزل نہیں کہی۔ یہ صحیح ہے کہ ان کی بعض نظمیں بڑی حد تک قاری کے لیے نافہم لگتی ہیں لیکن ایسی نظموں کی بھی کمی نہیں جو خیال کی پوری طرح ترسیل کرتی ہیں۔ انھوں نے کئی موضوع پر قلم اٹھایا اور ہندوستانی تہذیب کا محاسبہ کیا ہے۔ ہندوستان، جمہوریت، انسانیت سوز فسادات اور اپنے عصر کی ملکی سیاست وغیرہ ان کے خاص موضوع ہیں۔

باقر مہدی، ۱۹۲۷ء تا ۲۰۰۶ء

باقر کی نظموں کے پانچ شعری مجموعے ہیں ''شہر آرزو'' ۱۹۵۸ء، ''کالے کاغذ کی نظمیں'' ۱۹۶۷ء، ''ٹوٹے شیشے کی آخری نظمیں'' ۱۹۷۲ء، ''سیاہ سیاہ'' ۱۹۹۳ء اور ''باقیاتِ باقر مہدی'' ۲۰۰۸ء، مرتب: یعقوب راہی۔ باقر کی شاعری بھی اسی فکر نو سے جڑی ہوئی ہے جو بیسویں صدی نصف بعد سے اردو نظموں کا غالب حصہ رہی ہے۔ زندگی کی کشمکش، غمِ روزگار، معاشی بدحالی، تنہائی کا کرب، مصائبِ زمانہ اور نا آسودگی کا شدید احساس باقر کے یہاں ملتا ہے۔ ''بے نام رنگ''، ''نیا ڈرامہ''، ''حرف میں چنگاری''، ''اے سراپا الم!''، ''آخری فیصلہ؟'' اور ''آخری نظم لکھنے کی ایک ناکام کوشش'' ایسی نظمیں ہیں جن میں جنسی نا آسودگی کے کرب کا اظہار ملتا ہے۔ بقیہ مذکورہ بالا موضوعات میں باقر کی انفرادیت کا پہلو یہ ہے کہ ان کے یہاں ایسے مسائل پر عام شعرا کی طرح رونا دھونا نہیں ہے بلکہ ان کا لہجہ احتجاجی ہے۔ ان کے یہاں مصائب زمانہ کا اظہار ہے مگر نوحہ کی صورت میں نہیں، وہ قاری کو اپنے غم میں شریک ہونے کی نہیں بلکہ فکر نو کی دعوت دیتے ہیں۔ ان کی ایسی نظموں میں ''لمحوں کے قیدی''، ''دیمک''، ''چوپاٹی کی ایک رات''، ''نروان''، ''ویت نام''، ''نئی جستجو کا المیہ'' اور ''ٹھوکر ٹھوکر میرے عکس'' اہم ہیں۔ باقر مہدی کی کچھ نظمیں ایسی بھی ہیں جن میں ترقی پسند، جدیدیت اور مابعد جدیدیت کے حامی شعرا سے نظریاتی اختلاف کا اظہار ملتا ہے ان میں

''تصویر کا دوسرا رخ''، ''اک نیا رشتہ''، ''بڑے مسخرے ہو؟'' اور ''دونوں یکساں ہیں!'' وغیرہ نظمیں شامل ہیں۔ نظم ''دونوں یکساں ہیں!'' کا یہ اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

قلم بند کر کے / سارے کاغذ / یوں ہی تکتے رہنے سے / کوئی حل تمہیں کس
طرح مل سکے گا؟ / آسماں پارہ پارہ ہے / زمین تنگ ہے! / عام لوگوں کی مانند
/ ظلم دیکھو، سہو، چپ رہو / یا اردو کے نامی شاعروں کی طرح / حکومت کی حلقہ
بگوشی کرو! / نہیں یہ بھی ممکن نہیں! / تمہیں تمہیں موت کی جستجو ہے /
مبارک ہو / تمہاری / یہ زندگی / موت / دونوں یکساں ہیں!

باقر کو کسی کی تقلید پسند نہیں تھی انھوں نے اپنی نظموں میں الفاظ کے دروبست اور ترتیب میں غنائیت کو اہمیت نہیں دی ہے ان کی بہت سی نظمیں مبہم معلوم ہوتی ہیں۔ ان کے اس طرزِ اجتہاد پر ندا فاضلی فرماتے ہیں:

''باقر مہدی نے مزاج مخالف سماج میں لفظوں کے رواج کو احتجاج کے قریب کرنے کا تجربہ کیا ہے۔ جس کی قبولیت آسان نہیں.....اس قبولیت کے لیے اجتماعی نظر میں انفرادی جہت کی ضرورت ہے اور جو ادب میں کہیں کہیں اور کبھی کبھی ہی دکھائی دیتی ہے۔''[۳]

اپنی اس اجتہادی اور انفرادی طبیعت کے بارے میں باقر مہدی خود ایک نظم ''میرا تعارف'' میں فرماتے ہیں:

مرے نالے کی کوئی لے نہیں ہے / مشینی شور کی اک نغمگی ہوں! / مرا
منصب ہے رہبر سے الجھنا / میں فطری زندگی کی سرکشی ہوں! / نئے معنی کی
مجھ کو جستجو ہے / میں ہنگاموں کی پنہاں خامشی ہوں! / میں لفظوں سے
لکیریں کھینچتا ہوں / سیہ کاغذ کی الجھی سادگی ہوں!

باقر مہدی کی نظموں کی خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے طرزِ اظہار کے لیے الفاظ کے دروبست کو اہمیت دی اور بیسویں صدی نصف کے بعد فکر نو کے نام پر جدیدیت کے زیر اثر رواج پانے والی یاس و نا امیدی اور تنہائی پسندی کو نوحہ کے بجائے احتجاجی لب ولہجہ دینے کی کوشش کی۔

گنیش بہاری طرزؔ، ۱۹۲۸ء تا ۲۰۰۸ء

طرزؔ کے دو مجموعۂ کلام ''زندگی زنجیر کی'' ۱۹۸۷ء اور ''حنا بن گئی غزل'' ۲۰۰۳ء کو ملا کر کل ۲۶ نظمیں ہیں۔ طرزؔ نے روایتی ہیئتوں میں نظمیں کہی ہیں صرف ایک نظم ''کارگل کے شہیدوں کے نام'' آزاد نظم کے فارم میں ہے۔ یہ ایک تاثراتی نظم ہے جو کارگل کے جنگ کے موقعے پر کہی گئی تھی۔ اس کے علاوہ نظم ''یہ بمبئی ہے ہم نشیں'' بمبئی کی رعنائیوں کی مظہر ہے۔ نظم ''قدم ملا کے چلو'' قومی یکجہتی کی عمدہ مثال ہے۔ ''یاد ہے''، ''آنکھیں'' اور ''گزرا زمانہ'' وغیرہ عشقیہ نظمیں ہیں۔ نظم ''ابھی سے تم چلے کہاں'' عیش وطرب کا ماحول پیش کرتی ہے۔ نظم ''خدا'' تصوفانہ انداز میں ہے۔ ان کی سب سے اہم نظم ''گنیش درشن'' ہے، یہ ہندوؤں کے ہزاروں سال پر محیط مذہبی عقیدے پر ہے۔ بمبئی کی تیز رفتار زندگی کا یہ سچ بھی سنیں جسے طرزؔ نے ''یہ بمبئی ہے ہم نشیں'' میں کہا ہے:

نہ پیار ہے نہ دشمنی جو کام ہے تو دوستی
ملے تو جزوِ زندگی نہیں تو طرز اجنبی
یقیں کا بھی نہیں یقیں
یہ بمبئی ہے ہم نشیں

طرزؔ کی نظموں میں غمِ جہاں کا کوئی عنصر نہیں ملتا۔ ان کی نظموں کی ایک خوبی یہ ہے کہ اس میں پروفیسر ظہیر علی کے الفاظ میں ''ہندی کے سرل اور کومل الفاظ کو اردو لفظیات میں اس طرح پرو دیا ہے کہ اس سلکِ گہر کی چمک دمک میں مزید اضافہ ہوا ہے۔''[۳] یہ لفظیات غیر مانوس نہیں لگتے بلکہ ان کا استعمال نظم کے پس منظر کو اور بھی موثر بناتا ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نجدت طرازی کی دوڑ سے گریز کرتے ہوئے صرف انھیں موضوعات کو منتخب کیا جو ان کے مزاج سے مطابقت رکھتے تھے اور جذبہ کی تحریک پر قرطاس کی زینت بنتے رہے۔

شفیق فاطمہ شعریٰ، ۱۹۳۰ء تا ۲۰۱۲ء

ان کے شعری مجموعوں میں ''آفاق نوا'' ۱۹۸۷ء، ''گلۂ صفورہ'' ۱۹۸۷ء، ''کرن کرن یادداشت'' ۲۰۰۶ء اور کلیات ''سلسلۂ مکالمات'' ۲۰۰۶ء ہیں۔ جن میں کل ملا کر ۶۳ نظمیں ہیں۔ ترجمہ شدہ نظمیں مستثنیٰ ہیں۔ شعریٰ کی سبھی نظمیں کافی طویل ہیں۔ نظم ''شہر نوا'' میں افسانوی انداز سے شہری زندگی کے ہنگام کا نقشہ پیش کیا گیا ہے۔ ان کی بیشتر نظمیں ایسی ہیں جو اپنی طوالت

کی وجہ سے داستان معلوم ہوتی ہیں اور آخری مرحلے پر پہنچ کر قاری کے ذہن سے نظم کا عنوان محو ہو جاتا ہے اور یہ سمجھنا مشکل ہوتا ہے کہ اس کا مرکزی خیال کیا ہے اور نظم کے مختلف حصے ایک ہی موضوع سے مربوط ہیں یا نہیں؟ نظم ''شجر تمثال'' اور ''لب کشا'' جیسی نظمیں اس کی مثال ہیں۔ کچھ نظمیں ایسی ہیں جن کے ایک بند میں یا ایک حصے میں مفہوم کی ترسیل ہو جاتی ہے اور بقیہ نظم کا حصہ صرف طولانی محسوس ہوتا ہے۔ مثال کے لیے نظم ''بازگشت'' کے کچھ ابتدائی مصرعے جو اپنے عنوان کے مکمل ترجمان ہیں اور پر اثر بھی، ملاحظہ ہو:

نظم ''بازگشت''

نغمہ زار درد کی جانب چلے ہم /ایک بھی ذرہ نہ کچلا جائے اس رفتار سے /نغمہ
زار درد کی جانب چلے ہم /کنج میں پیڑوں کے سورج جھانکتا تھا /کوہساروں
سبزہ زاروں میں جھمکتی روشنی کا جشن تھا /جشن جاری ہی رہے گا تا ابد /
جاری رہے /نغمہ زار درد کی جانب چلے ہم /لعل و مرمر سے گندھا قالب /اور
اس کے ماورا اس کے قریب /بجلیوں جیسا منصفی اک وجود /چار سو بکھرے
ہوئے خاموش سوئے آسماں /ہم کہاں ہیں۔ نغمہ زار درد ہے یہ (ہم کہاں)

شعریٰ کی علمیت اور شعور پر ان کے شعری مجموعہ ''گلۂ صفورہ'' کے تعلق سے محمد حسین فرماتے ہیں:

''وہ ہندوستانی اور اسلامی تاریخ و تہذیب کے سبھی سرچشموں سے سیراب تھیں۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم، موسیٰ علیہ السلام، گوتم بدھ، سیتا، مریم صدیقہ، رابعہ تابعیہ، بانوئے فرعون۔ ہر کسی کا تذکرہ شعریٰ کی شاعری میں ملتا ہے۔ بصرہ ہو یا خلد آباد یا اجنتا اور ایلورہ، ہر تہذیبی و تاریخی سرچشموں سے یکساں استفادہ کرتی ہیں۔ ایسے پہلو ان کی شاعری میں ان کے گہرے تاریخی شعور اور علم کی گواہی دیتے ہیں۔ تاریخ و تہذیب کے حوالے سے ان کا علم کافی وسیع تھا۔''[۴]

مذکورہ بالا قول کی روشنی میں یہ واضح ہوتا ہے کہ شعریٰ کے یہاں تلمیحات، استعارے اور علامتوں تک رسائی کے لیے ہندوستانی تاریخ و تہذیب اور قرآن و احادیث میں مذکور مقامات و واقعات کے علم کے علاوہ ان کے کلام کے مطالعے کے لیے

پرسکون دل و دماغ کا ہونا ضروری ہے کیوں کہ شعریٰ کی نظموں میں کسی خیال یا واقعہ کی کڑیاں آپس میں مربوط نہیں ہوتیں بلکہ ان کے یہاں ایک خیال سے دوسرے خیال میں جست لگانے کا انداز ملتا ہے یہی وجہ ہے کہ ان کا کلام قاری سے سنجیدہ مطالعے کا مطالبہ کرتا ہے۔

شعریٰ کے یہاں جہان و کائنات، سیرتِ اہل بیت اور تابعین پر بھی نظمیں ملتی ہیں۔ نئی علامتیں اور منظر بہ منظر گفتگو کا انداز ان کی شاعری کی شناخت ہے۔ اردو نظموں کی دیگر شاعرات کی طرح داخلی احساسات کا اظہار ان کے یہاں بہت کم ہے اور ان کا ذاتی غم بھی غمِ کائنات کے پیرائے میں نظر آتا ہے۔

عزیز قیسی، ۱۹۳۱ء تا ۱۹۹۲ء

قیسی کے شعری مجموعے ''گرد بار'' اور ''آئینہ در آئینہ''، ۱۹۷۲ء، ہیں۔ ''گرد بار'' حاصل نہ ہوسکا اور ''آئینہ در آئینہ'' میں کل ۵۱ نظمیں ہیں۔ عزیز قیسی ترقی پسند تحریک سے بھی وابستہ رہے لیکن ان کی شاعری پر کسی تحریک کا سکہ نہیں لگایا جاسکتا۔ ان کی نظموں میں نصف صدی کے بعد سے پیدا ہونے والے ملک کے تمام حالات اور صنعتی شہروں میں پیش آنے والے روزگار کے مسائل اور بمبئی کی عام زندگی کا بھی ذکر ہے۔ ان کی نظموں میں ذاتی غم، انسانی المیے اور معاشرے میں فرد کی بے وقعتی کا جگہ جگہ احساس ہوتا ہے۔ ان کی نظموں پر وحید اختر کچھ اس طرح اظہارِ خیال کرتے ہیں:

> ''قیسی کے یہاں نہ تو صنعتی شہر کا تسلط ہے، نہ اس سے فرار کا فارمولہ، وہ حقیقت پسندی کی آنکھ اور اپنے وجود کے تجربے سے اپنے ملک اور خصوصاً بڑے شہروں کے بدلتے ہوئے معاشرے اور ٹوٹتی ہوئی اقدار کا عرفان حاصل کرتے ہیں۔'' ۵

قیسی کے طرزِ اظہار کی چند مثالیں مندرجہ ذیل ہیں:

نظم ''مآلِ کار''

آس کے یاس کے / جہد کے عیش کے / آئینے دیکھ کر تھک گئے / کیا کریں
/ اس تسلی پہ ہم لوگ برباد ہیں / یہ زمیں ہم سے پہلے بھی آباد تھی!

نظم ''ازل ___ ابد''

روحوں کو دوام دینے والو! /جسموں کی سبیل کچھ نکالو /شعلہ کوئی مستعار دے

دو / یا لاش کو اب مزار دے دو

نظم ''بنامِ ابنِ آدم''

اب تک تم سے کہا گیا ہے /انساں فانی موت اٹل ہے /جیون جل ہے /

جس کی دھار کبھی نہ ٹوٹے /جو آتا ہے مرجاتا ہے /جو آئے گا مرجائے گا میں

تم سے کہنے آیا ہوں /انساں لافانی ہے آخر ہے /موت تغیر کا اک پل ہے

/جیون جل ہے / جس کا کوئی انت نہیں ہے /رہ جائے تو یہ ساگر ہے /اور

مرجائے تو بادل ہے!

مختلف موضوعات پر ان کی نظمیں ''تلازم''، ''دادگر''، ''چاندنی کے شہر میں''، ''درد کے حیلے، غم کے بہانے''، ''شبِ غم''، ''مکتی'' اور ''فصل رائیگاں'' وغیرہ اہم نظمیں ہیں۔ قیسی کی نظموں میں، تذبذب، انتشارِ ذہنی، حالات و مسائل سے فراریت، ذات کی تاریکیوں میں گمشدگی اور زندگی سے بے زاری وغیرہ کا عام رجحان نہیں ہے۔ اگر ایسا کوئی موقع آیا بھی ہے تو اسے کوئی خاص توجہ نہیں دی جاسکتی اور نہ ہی ایسی نظموں کے تعلق سے خاص گفتگو کی جاسکتی ہے۔

سمپورن سنگھ گلزار، پیدائش: ۱۹۳۴ء

گلزار کے پانچ شعری مجموعے ''چاند پکھراج کا'' ۱۹۹۲ء۔ ''رات پشمینے کی'' ۲۰۰۹ء۔ پندرہ پانچ پچہتر'' ۲۰۱۰ء۔ ''یار جلاہے'' اور ''تروینی'' ۲۰۱۲ء، منظر عام پر آچکے ہیں۔ 'تروینی' گلزار کی خودساختہ صنف کا مجموعہ ہے۔ 'یار جلاہے' حاصل نہ ہوسکا، باقی تینوں مجموعوں کو ملا کر کل ۳۱۸ نظمیں ہیں۔ گلزار نے کثرت سے نظمیں کہی ہیں۔ ان کی نظموں کی خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے اپنی بات کا طرز ہی نہیں، علامتیں اور الفاظ بھی دیگر شعرا سے الگ منتخب کیے اور اپنی آس پاس کی زندگی کے چھوٹے بڑے واقعات و حالات کے ہر پہلو کو بغور دیکھا اور محسوس کیا ہے۔ ان کی نظموں میں پہاڑ، جھرنے، درخت، ساون، سمندر، چاند، سورج

اوردن رات جیسے الفاظ ،استعاروں،تشبیہوں اور علامتوں کی صورت خوب استعمال ہوئے ہیں۔موضوع کی ان کے یہاں کثرت ہے۔ان کے موضوعات میں،موسم،فساد،ممبئی میں فٹ پاتھ کی زندگی،صنعتی شہر کی مصروف زندگی،کائنات اورذرہ وغیرہ ہیں، کچھ شہروں کو بھی اپنی نظموں کا عنوان دیا، ''ممبئی''،''مدراس''،''نیویارک''،''دلی کی دوپہر''اور''کلکتہ'' وغیرہ نظمیں ان شہروں کا آئینہ ہیں۔ممبئی کی زندگی پر''فٹ پاتھ''اور'' ہنی مون'' موثر نظمیں ہیں۔سڑکوں پر چند پیسوں میں تعویذ بیچنے والے باباؤں پر نظم''بابا بگلوس'' ہے۔تین نظمیں''خدا'' کے عنوان سے ہیں۔جن میں خدا کو موضوع بنا کر زمین کے مسائل پر خطاب کیا گیا ہے۔''فسادات'' کے عنوان سے چھ نظمیں ہیں،اس طرح چھوٹے چھوٹے کئی موضوع پر انھوں نے نظمیں کہی ہیں۔جیسے ''وہی گلی تھی''،''وہ لاش''،ٹریفک سگنل''اور''ایش ٹرے پوری بھر گئی'' وغیرہ جیسے بہت سارے موضوعات ہیں جنھیں عام طور پر غیر اہم سمجھا جاتا ہے لیکن گلزار نے انھیں اہمیت دی۔کچھ نظمیں تو ایسی ہیں جن میں سے ایک دو مصرع ہی اپنے آپ میں مکمل نظم معلوم ہوتے ہیں۔مثال دیکھیں:

۱۔ نظم''آشوب''

روز صبح اخبار مرے گھر
خون میں لت پت آتا ہے

۲۔ نظم''صلہ''

ترے غم کا نمک چکھ کر
بڑا میٹھا لگا ہے زندگی کا ذائقہ مجھ کو

۳۔نظم''ناسٹیلجیا''

میں نے ماضی سے کئی خشک سی شاخیں کاٹیں
تم نے بھی گزرے ہوئے لمحوں کے پتے توڑے

۴۔ نظم''مکمل نظم''

لفظ کاغذ پہ بیٹھتے ہی نہیں
اڑتے پھرتے ہیں تتلیوں کی طرح

اس طرح کی بہت سی مثالیں مل جائیں گی۔گلزار کے یہاں ماضی کی یادوں کا اظہار کئی پہلوؤں سے ہوا ہے جس میں بچپن، جوانی، اپنا گاؤں اور ان سب سے متعلق کئی واقعات کا ذکر ہوا ہے۔علاوہ ازیں ابتدائی محبت، جسے کبھی جاناں اور کبھی سوناں کہہ کر مخاطب کرتے ہیں، وہ ان کے تینوں مجموعوں میں رہ رہ کر جھلکتی ہے جس کا اعتراف انھوں نے نظم''میں فقرے کاٹتا پہلے ہوں''میں اس طرح کیا ہے:

مجھے ڈر یہ نہیں کہ میں بھلا پایا نہیں اس کو
مجھے ڈر یہ ہے وہ مجھ کو ہمیشہ یاد رکھتی ہے

اس محبت میں بے وفائی نہیں بلکہ بچھڑنے کا کرب ہے، درد، خلش اور تڑپ ہے جسے وہ موقع بہ موقع بیان کرتے ہیں۔

ظفر گورکھ پوری، ۱۹۳۵ء تا ۲۰۱۷ء

ان کے شعری مجموعوں کی ترتیب کچھ اس طرح ہے، ''تیشہ'' ۱۹۶۲ء، ''وادیِ سنگ'' ۱۹۷۵ء، ''ناچ ری گڑیا'' (بچوں کی نظمیں) ۱۹۷۸ء، ''سچائیاں'' (بچوں کی نظمیں) ۱۹۷۹ء، ''گوکھرو کے پھول'' (غزلوں کا مجموعہ) ۱۹۸۶ء، ''چراغِ چشمِ تر'' ۱۹۸۹ء، ''آر پار کا منظر'' (غزلوں کا مجموعہ) ۱۹۹۷ء، ''زمین کے قریب'' ۲۰۰۱ء، ''ہلکی ٹھنڈی تازہ ہوا'' ۲۰۰۹ء، اور ''مٹی کو ہنسانا ہے'' (گیت اور دوہے) ۲۰۱۲ء۔ ظفر کی کل نظموں کی تعداد ۱۵۴/ ہے۔ ان کی ابتدائی نظمیں عشقیہ ہیں اور اس کے بعد کی، آزادی کے خواب کی کربناک تعبیریں۔ کچھ نظمیں سیاسی اور حب الوطنی کے موضوع پر بھی ہیں۔ ان کی نظموں کا بڑا حصہ وہ ہے جس میں ایک نوجوان اپنے بوڑھے ماں باپ، جوان بہن اور بیوی کے لیے پر مسرت خواب لے کر شہر کا رخ کرتا ہے جہاں ایک عرصہ بے روزگاری میں گزارتا ہے، اسکولوں، ملوں اور کارخانوں میں نوکری کرتا ہے مگر تنخواہ اتنی قلیل ہے کہ زندگی کی اہم ضرورتیں بمشکل پوری ہوسکیں۔ کبھی جوان بہن کی آرزوؤں اور والدین کے سپنوں کا خیال کرتا ہے تو کبھی بیوی کی فرقت اسے تڑپاتی ہے۔ دعوتِ عشق بھی وہ اسی لیے قبول نہیں کر پاتا کہ وہ ایک قلاش شخص ہے۔ اک طرف وطن کی مٹی کی خوشبو اسے تڑپاتی ہے تو دوسری طرف غمِ روزگار اسے چین نہیں لینے دیتا۔ شہر کی مشینی زندگی میں یہ نوجوان خود کو مشین کا ایک پرزہ تصور کر لیتا ہے اور نظم ''کرشن کا جنم'' میں اپنی بیوی سے یوں مخاطب ہوتا ہے:

بے کسی شاہجہاں کو بھی سمجھتی ہے فقیر — مفلسی تاج محل کو بھی کھنڈر کہتی ہے
فاقہ کش تن کے چٹختے ہوئے اعضا کی قسم — تیری پائل، ترے گھنگھرو کی چھنک کچھ بھی نہیں
آج اک گیہوں کی روٹی کی مہک کے آگے — میری رادھا تیری زلفوں کی مہک کچھ بھی نہیں
مانگ ہاں مانگ، دعا مانگ دعا مانگ کہ میں — اب کبھی مرکے جنم لوں تو کرشنا نہ رہوں
فاقہ مستوں کے لیے، تیرے لیے سب کے لیے — خوشۂ گندم و جَو بن کے زمیں سے میں اُگوں
تو مجھے کرشن سمجھتی ہے تو چل یوں ہی سہی

آزادی کے بعد سے صدی کے اختتام تک اس نوجوان کے ذریعے ملک کے معاشی حالات کا المیہ پیش کیا گیا ہے۔

فراقؔ گورکھپوری ان کی نظموں پر کہتے ہیں:

''ان نظموں کی آواز زندگی کی آواز ہے۔ ان نظموں میں دردِ انسانیت کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔''

ظفرؔ کی نظمیہ شاعری پر ڈاکٹر افغان اللہ اپنے تاثرات کا اظہار کچھ یوں کرتے ہیں:

''ظفرؔ کے کلام میں تشنگی، آوارگی، تنہائی، سناٹا، جنگل، ویرانہ پن، گھر، گاؤں، خواب، زخم، آنچ، درخت، چڑیاں، احسان، مجبوری، پیاس، دریا، رات، جگنو، دھوپ۔ سایہ اتنی بار اتنے پہلوؤں سے آئے ہیں کہ وہ شاعر کے اصل وجود کا اتا پتا دے گئے ہیں۔''[۶]

''چراغِ چشمِ تر'' کی تمام نظمیں ظفرؔ کے جواں مرگ بیٹے کی وفات پر نوحہ ہیں۔ اکیسویں صدی کی ابتدا سے ان کی نظموں میں ایک حوصلہ منداور پرعزم انسان دکھائی دیتا ہے۔ نظم ''مرے وجود میں اک نہر ہے'' کا نمونہ ملاحظہ فرمائیں:

کہو یہ کالی ہوا سے / تو ہار جائے گی / یہ کالی دھول، یہ کالے غبار کے طوفاں
/ دھنک بجھائیں گے میری؟ / مری زمیں کا سنگھار اس قدر نہیں کمزور /
کچھ اتنا کچا نہیں میرے آسمان کا رنگ / کہو یہ کالی ہوا سے

القصہ مختصر کہ ظفرؔ کی نظمیہ شاعری، زندگی کے مسائل سے جوجھتے ہوئے مصائب و آلام زدہ انسان کے یاس و امید کی شاعری ہے۔

بشر نوازؔ، ۱۹۳۵ء تا ۲۰۱۵ء

نوازؔ کے شعری مجموعے ''رائیگاں'' ۱۹۷۲ء، میں، کل ۳۴ نظمیں ہیں۔ اس کے علاوہ ان کا اور کوئی کلام دستیاب نہ ہوسکا لیکن ان نظموں کے مطالعے سے نوازؔ کی انفرادیت محسوس کی جاسکتی ہے۔ ان کے یہاں موضوع کا تنوع نہیں ہے۔ ان کے خیال کا دائرہ انسان کی ذات سے منسلک، مختلف حالات و کیفیت کے گرد رہتا ہے۔ نظم ''بڑے شہر کا دن'' اور ''مجھے کہنا ہے'' ایسی نظمیں ہیں جس میں وہ ذات سے باہر نکل کر دنیا کے حالات پر بھی نظر کرتے ہیں۔ نظم ''بڑے شہر کا دن'' میں صنعتی شہروں کی مصروف ترین زندگی جہاں لوگ اپنی نفسانفسی میں مبتلا رہتے ہیں، ایک دوسرے کی خیر خیریت پوچھنے کا بھی ان کے پاس وقت نہیں ہے، ایسے پرشور صنعتی شہروں کو نوازؔ نے چیختے چنگھاڑتے شہرِ خموشاں سے تشبیہہ دی ہے۔ نظم ''مجھے کہنا ہے'' میں انسانی فطرت کے ان

مظاہر کا ذکر ہے جو اسے دوسری مخلوقات سے منفرد کرتے ہیں اور جس سے انسانی سرشت کو مفر نہیں۔ مثال دیکھیں:

مجھے کہنا ہے / ہم سب اپنی دھرتی کی / برائی اور بھلائی، سختیوں اور نرمیوں،
اچھائیوں، کوتاہیوں، ہر رنگ، ہر پہلو کے مظہر ہیں / ہمیں انسان کی مانند /
خیر و شر، محبت اور نفرت، دشمنی اور دوستی کے ساتھ جینا ہے / اسی دھرتی کا شہد و
سم / اسی دھرتی کے کھٹ مٹھ جانے پہچانے مزے کا جام پینا ہے / مجھے بس
اتنا کہنا ہے / کہ ہم کو آسمانوں یا خلاؤں کی کوئی مخلوق مت سمجھو

نوازؔ کی دو نظمیں ''وصال'' اور ''جھوٹ تقدس رشتوں کا'' جنسی موضوع پر ہیں۔ علاوہ ازیں ''ایک خواہش''، ''دائرہ''، ''ایک نظم اس کے لیے''، ''پہلی بارش'' اور ''رتوں کا جادو'' وغیرہ ایسی نظمیں ہیں جس میں جسمانی آسودگی کو مرکزی خیال کی حیثیت حاصل ہے۔ نوازؔ کی نظموں کی خوبی یہ ہے کہ ان کا طرزِ اظہار افسانوی ہے لیکن مرکزی خیال حقیقت سے قریب تر ہے۔ ان کے یہاں علامتوں اور استعاروں کی بھرمار نہیں ہے اور نہ ہی پیچ در پیچ اندازِ گفتگو۔ بس وہ جو کہنا چاہتے ہیں، اسے ایک منظر اور ماحول میں رکھ کر پیش کر دیتے ہیں۔

مقتدیٰ حسین ندافاضلی، ۱۹۳۸ء تا ۲۰۱۶ء

ان کے چھ شعری مجموعے بالترتیب اس طرح ہیں ''لفظوں کا پل'' ۱۹۶۹ء، ''مور ناچ'' ۱۹۷۸ء، ''کھویا ہوا سا کچھ'' ۱۹۹۶ء، ''زندگی کی تڑپ'' ۲۰۰۷ء، ''آنکھ اور خواب کے درمیان'' ۲۰۱۱ء، اور ''شہر میرے ساتھ چل تو'' کے علاوہ کلیات ''شہر میں گاؤں'' ہے۔ اور سب کو ملا کر کل ۲۰۲ نظمیں ہیں۔ ندافاضلی کی نظموں میں سگریٹ اور سورج، استعارہ اور علامت کے طور پر زیادہ استعمال ہوئے ہیں۔ پہلے مجموعے 'لفظوں کا پل' کی کئی نظموں کے مرکزی خیال کی تکمیل میں سردی کی رات کا سہارا لیا گیا ہے۔ ان کی نظموں میں زندگی کے مختلف پہلوؤں اور چھوٹے بڑے حالات و واقعات کے بیان میں کہیں واضح الفاظ اور کہیں علامتوں سے کام لیا گیا ہے۔ عورت کے فطری جذبوں کے اظہار پر ان کی نظم ''ایک بات'' میں جہاں گھر کے آنگن میں سب لوگ بیٹھے ہوں وہاں ایک خلوت کی متمنی بیوی اپنے شوہر کو متوجہ کرنے کی خاطر پیر کھجانا، انگوٹھی کے نگ کو دیکھنا، چٹکی سے تنکا توڑنا اور چارپائی کے بان مروڑنا جیسی حرکتوں سے خاموش پیغام دیتی ہے۔ نظم ''دیوار کے پیچھے'' اور ''پرائی آگ''، فطری تقاضوں کے موضوع پر ہے جس میں علامتوں کے ذریعے قاری کے ذہن کو ان خیالوں کی طرف منتقل کر دیا گیا ہے۔ نظم ''پاسپورٹ آفیسر کے

نام''، ''سرحد پار کا ایک خط پڑھ کر'' اور ''لفظوں کا پل'' میں ہندو پاک کے سیاسی تنازعے سے دونوں طرف کی عوام کے درمیان بڑھتے ہوئے فاصلوں کا کرب بیان ہوا ہے۔ان کی نظموں کے موضوعات میں دیہات، چھوٹے شہر، ممبئی کی زندگی اور فسادات وغیرہ بھی شامل ہیں۔نظم ''جنگ'' میں زندگی کی ان حقیقتوں کی طرف اشارہ ہے جو سرحدوں کی جنگ کے خاتمے کے بعد گھروں میں شروع ہوتی ہے۔نظم ''اپنا گھر'' افسانوی اور حقیقی زندگی کے دونوں رخ کا آئینہ ہے۔نظم ''نئے گھر کی پہلی نظم'' میں انسان کی بے جا خواہشوں کو سارے مصائب کی وجہ بتائی گئی ہے۔اس نظم کا متن ملاحظہ فرمائیں:

چار دیواروں پہ چھت باندھ کے / جب وہ اترا / جسم تھا اس کا پسینے سے
شرابور مگر / گھر کی دیواروں نے / دیواروں کی زینت کے لیے /
ساز و سامان کی / فہرست لگا دی ایسے / دیکھتے دیکھتے / ٹی وی /
فِرج / صوفہ بن کے / آدمی کھو گیا عزت کا تماشہ بن کے / ہر گھڑی
بھاگتے رہنا ہے / مقدر اس کا / گھر کی دیواروں نے ہی / چھین لیا
گھر اس کا

ندا فاضلی کے یہاں ایسی نظمیں بھی ہیں جن کے عنوان ان نظموں کے مرکزی خیال کی علامت ہیں جیسے ''گلاب کا پھول''، ''کھلونے''، ''انتظار''، ''سمجھوتا''، ''جنگ''، ''لگاؤ'' اور ''محبت'' وغیرہ علامتی نظمیں ہیں۔ان کی نظمیں، زندگی کی سچائیوں کا آئینہ ہیں جس میں نظر آنے والا ہر عکس قاری کو کراہت کے بجائے غور و فکر کی دعوت دیتا ہے۔اس سلسلے میں نظم ''چھوٹا آدمی''، ''نیا دیوتا''، ''ایک قومی رہنما کے نام''، ''ایک افسانہ'' اور ''ناجائز اولاد'' وغیرہ اہم نظمیں ہیں۔نظم ''ناجائز اولاد'' میں بھوک، گھاس اور پانی کو آسمان اور زمین کے جائز رشتے کی ناجائز اولاد کہا گیا ہے، جو زمینی سرحدوں اور قانون کو نہیں مانتے۔ندا فاضلی کی نظموں کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ خارجی واقعات کو داخلی جذبوں میں شیر و شکر کر کے پیش کرتے ہیں۔

حسن کمال، پیدائش: ۱۹۳۹ء

ان کا ایک ہی شعری مجموعہ ''حاصل یہی'' ۲۰۰۵ء، اب تک منظر عام پر آیا ہے جس میں کل ۱۳ نظمیں ہیں، اس کمیت کے باوجود حسن کمال کی نظمیں اہمیت کی حامل ہیں۔ چند موضوعات کے دائرے میں انھوں نے نظم کی خصوصیت کا لحاظ رکھا ہے۔نظم

''پرندے لوٹ آتے ہیں'' ایک طویل نظم ہے جس میں 'پرندہ' استعارہ ہے پردیسی کا، جسے مختلف پہلوؤں سے پیش کیا گیا ہے۔ نظم ''ایک خط'' ایک غریب الوطن کا خط ہے، اس مختصر نظم میں شاعر نے چند لفظوں میں پوری شہری زندگی کا حال بیان کر دیا ہے، ملاحظہ فرمائیں:

باتیں، لڑائی جھگڑے، شرابیں، مباحثے /ایک دوسرے کی کاٹ /بھلا اپنا،
جوڑ توڑ، / ہر چیز چھین لینے، جھپٹ لینے کی ہوس /اب اور اپنا حال لکھوں
کیا، سمجھ لو بس /اللہ کا لاکھ شکر ہے میں خیریت سے ہوں /اس شہر نے غرض
مجھے جینا سکھا دیا /تم اپنی خیریت سے کبھی مطلع کرو /کچھ اپنا حال، گاؤں کا
کچھ ماجرا لکھو /ساون میں اب بھی کھیت نہاتے ہیں یا نہیں /فصلیں کٹیں تو
شور مچاتے ہیں یا نہیں //راتیں تھپک تھپک کے سلاتی ہیں یا نہیں /پنگھٹ پہ
آ کے صبحیں نہاتی ہیں یا نہیں /گر ہو سکے تو پیار کے دو بول بھیج دو /ممکن اگر
ہو گاؤں کا ماحول بھیج دو

نظم ''تاریخ کا ایک صفحہ'' نئی اور پرانی قدروں کا تقابل پیش کرتی ہے۔ نظم ''فرامودہ''، ''ایک نظم'' اور ''تم ہوتے تو'' پرانی محبت کی کسک کو ظاہر کرتی ہیں۔ نظم ''جہان آباد'' ایک انسان سوز المیے پر تاثراتی نظم ہے۔ حسن کمال کی نظمیں اچھی نظموں کے مقابل رکھی جاسکتی ہیں۔ یہ نظمیں جدید نظم کے فن اور شعریت کے تقاضے کو پورا کرتی ہے۔

رفیعہ شبنم عابدی، پیدائش: ۱۹۴۳ء

رفیع شبنم کے شعری مجموعوں میں ''موسم بھیگی آنکھوں کا'' ۱۹۸۵ء، ''اگلی رت کے آنے تک'' ۱۹۹۶ء، ''آنگن آنگن پروائی'' (غزلوں کا مجموعہ) ۲۰۰۹ء اور ''نئی گھٹائیں اتر رہی ہیں'' ۲۰۱۰ء، کو ملا کر کل ۱۴۲ نظمیں ہیں۔ رفیعہ شبنم نے شہری زندگی کے مسائل، فساد اور عالمی مسائل پر بھی نظمیں کہی ہیں لیکن ان کی بیشتر نظموں کے موضوع نسائی مسائل سے تعلق رکھتے ہیں جس میں فرقت اور قربت کی کشمکش جگہ جگہ نظر آتی ہے۔ کہیں محبوبہ کے روپ میں تو کہیں بیوی کے روپ میں اور کہیں معاشرے میں مظلوم کی طرح تو کہیں تہذیب اور خاندان کی قید میں۔ ''تراشیدی، پرستیدی، شکستی''، ''آخری خواش''، ''دعا''، ''بنت مریم''، ''ادھوری ملاقات'' اور ''دریچوں کے تلے'' وغیرہ ایسی نظمیں ہیں جن میں عورت بحیثیت محبوبہ اپنے خوابوں کی شکست و ریخت کا

اظہار کرتی نظر آتی ہے۔ رفیعہ شبنم کی ایسی نظمیں توجہ طلب ہیں جن میں ایک عورت بحیثیت بیوی نظر آتی ہے، وہ گھریلو ذمے داریوں اور خاندان کی عزت و ناموس کا خیال کرتی ہے، معاشرے کی باعزت عورت ہے، اسے خاندان اور معاشرے سے کوئی شکایت نہیں، اس کا سارا تنازعہ اس کے شوہر سے ہے۔ وہ شوہر جو اس کے بالوں کی چاندی دیکھ کر پہلی جیسی کشش محسوس نہیں کرتا، وہ شوہر جو پہلی سی محبت کی گرم جوشی نہیں رکھتا اور اس کی طرف سے توجہ کم کر دیتا ہے۔ عام طور پر عورت کی یہ فطری سوچ ہے کہ اس کا شوہر اگر حسب عادت کوئی کام نہ کرے تو بھی شک کرتی ہیں، مثلاً عورت کے گھریلو کام اور پکوان میں نقص نکالنے والا شوہر کسی دن خاموش رہے تو بھی عورت کو شک، یہ بھی مرد کی بے توجہی میں شمار ہوگا۔ ایسے موقعوں کے لیے نظم ''جانے کیوں'' بہت ہی خوب ہے جس میں ایک شوہر عورت کے گھریلو کام میں نقص نکالتے ہوئے کہتا ہے: ''میں نے مانا بہت حسیں ہو مگر / تم ہی تم زندگی نہیں ہو مگر''۔ ان سب باتوں کی عادی عورت جب شوہر کی خاموشی دیکھتی ہے تو اسے شوہر کی بے توجہی کو کہیں اور دل چسپی سے تعبیر کرتے ہوئے کہتی ہے:

نظم ''جانے کیوں ''

جن کو کالی گھٹائیں کہتے تھے /ان پہ چاندی چمک گئی شاید /یا مرے خوش نگاہ! لگتا
ہے / یہ نظر پھر بہک گئی شاید

اسی طرح ایک نظم ''تمہاری سال گرہ'' ہے جس میں احباب و اقارب کی طرف سے پیش کی جانے والی مبارک باد، جن میں عقیدتوں کی مہک اور خلوص کی دھوپ بھی شامل ہے۔ شوہر کی اس سال گرہ پر دیکھیے ایک بیوی کیا کہتی ہے:

مگر /قسم ہے تمہیں /صاف صاف بتلانا /کہ تم کو اس کا بہت انتظار تھا کہ نہیں
؟/ وہ ایک خط جو کسی نے تمہیں نہیں بھیجا /وہ ایک فون جو آنا تھا اور نہیں آیا!

اس طرح کی نظموں میں ''جو تم کہو تو''، ''معمول'' اور ''رنگوں کا زوال'' وغیرہ اہم نظمیں ہیں۔ کچھ ایسی نظمیں بھی ہیں جس میں ایک بیوی اپنے شوہر کی بے توجہی کا شکار ہو کر کسی اور سے دل لگانے کا خیال کرتی ہے مگر عزت و ناموس کا لحاظ کرتے ہوئے وہ ایسا نہیں کر پاتی۔ نظم ''مادام'' اور ''سر بہ زانو زلیخا پریشان ہے'' ایسے ہی جذبات کی عکاس نظمیں ہیں۔ رفیعہ شبنم کے یہاں بحیثیت بیوی، شوہر کی کم نگاہی یا بے التفاتی کا ردعمل اس صورت میں نہیں ہے جیسا ۱۹۷۰ء کے قریب تانیثی تحریک کی شکل میں پہلی بار فرائیڈن نے آزادیِ نسواں کا باغیانہ نعرہ بلند کیا تھا۔ بعد میں اس تحریک کی قائد عورتوں کو یہ احساس بھی ہوا کہ یہ نظریہ

گمراہ کن ہے۔جس کا اظہار بھی انھوں نے کیا۔رفیعہ شبنم اپنے ردعمل کے اظہار کو ''تانیثی'' نہیں مانتیں اور اس نظریے پر یوں اظہار کرتی ہیں:

''.....یہ نسائی اور تانیثی اصطلاحیں اور تحریکیں میرے نزدیک کچھ اہمیت نہیں رکھتی۔میری نگاہ میں یہ ایک فریب محض ہے۔میں نہیں جانتی کہ اپنی حق تلفی کا شکوہ یا عورت مخالف معاشرے کے جبر کا گلہ تانیثیت ہے یا محض نسائی جذبات کا انفرادی اظہار۔اور نسائی جذبات ہی کیوں کہا جائے،انسانی جذبات کیوں نہیں؟''[۷]

رفیعہ شبنم نے اپنے اس نظریے کا اظہار اپنی نظموں ''شرطِ رفاقت'' اور ''اعتراف'' میں واضح طور پر کیا ہے،مثال دیکھیں:

نظم ''شرطِ رفاقت''

اپنی پاکیزہ تمناؤں کی تکمیل کا حق ہے مجھ کو
اپنے معصوم سے جذبات کی ترسیل کا حق ہے مجھ کو
یہ زمیں میری بھی، یہ دشت وچمن میرے بھی
صرف آنگن ہی نہیں کوہ ودمن میرے بھی
ماہ وانجم بھی مرے، نیلا طبق میرا بھی
جتنا ان پر ہے تمہارا، وہی حق میرا بھی
شرط بس یہ ہے
کہ تم ساتھ رہو
پاس رہو

نظم ''اعتراف'' تانیثیت تحریک کے نظریے کی نفی کرتی ہے۔۱۹۹۶ء میں انھوں نے اپنے شوہر کے دورۂ قلب کے موقع پر یہ نظم کہی تھی،ملاحظہ ہو:

جس کا نام عورت ہے اک عظیم طاقت ہے
پھر کسی کی حاجت کیا مرد کی ضرورت کیا

مرد کے بغیر عورت کب بھلا ادھوری ہے؟
مرد کا وجود آخر پھر کہاں ضروری ہے؟
عالمی حسینائیں معتبر ادیبائیں
شاعراتِ دانش ور بیگماتِ اہلِ زر
دخترانِ فکروفن بیبیاں پسِ چلمن
سب یہی تو کہتی ہیں سرخ رو سی رہتی ہیں

آج ایک لمحے کو جب تمہارے سینے میں
سانس ہوگئی محبوس قلب کی تمہارے جب
دھڑکنیں ہوئیں معدوم جانے کیوں ہوا محسوس
عالمی حسینائیں معتبر ادیبائیں
شاعراتِ دانش ور بیگماتِ اہلِ زر
دختران فکرو فن بیبیاں پسِ چلمن
سب یہ جھوٹ کہتی ہیں احمقوں کی جنت میں
مدتوں سے رہتی ہیں

شوہر سے ذہنی عدم آہنگی اور نا اتفاقی پر ''نصف بہتر'' اور ''واماندگیٔ شوق تراشے ہے پناہیں'' عمدہ نظمیں ہیں۔ تاثراتی نظموں میں شہر سورت کے فساد سے متاثر ہو کر ایک طویل نظم ''زاری'' کہی، بعد میں ''میں کہ ایک عورت ہوں'' کے عنوان سے ناری نامہ کے طور پر مجموعہ ''نئی گھٹائیں اتر رہی ہیں'' میں شامل کرلیا۔ اس کے علاوہ ''کشمیر کی ایک ڈوبتی شام''، ''اسرائیل''، ''فلسطین'' اور ''جو چپ رہے گی زبان خنجر (بھاگل پور کے فساد پر)'' اہم نظمیں ہیں۔ ان کے مجموعے ''نئی گھٹائیں اتر رہی ہیں'' میں نظم ''میڈیا'' اپنے اس موضوع پر طرزِ اظہار کے لحاظ سے ندرت رکھتی ہے۔ ڈاکٹر ابوالفیض سحر رفیعہ شبنم کی شاعری کو ''نئی

پگڈنڈی'' اور ''نئی وادی'' کی طرف لے جانے والی شاعری تو تسلیم کرتے ہیں لیکن ساتھ ہی ان کی شاعری کو ''پروین شاکر، فہمیدہ ریاض اور کشور ناہید کی 'عورت پن' کی توسیع''[۴] قرار دیتے ہیں جو کہ درست نہیں ہے، کیوں کہ مذکورہ شاعرات کے یہاں محبوب کا تصور عام ہے جب کہ رفیعہ شبنم کی شاعری میں شوہر ہے اور وہی ان کا محبوب بھی۔

احمد وصّی، پیدائش: ۱۹۴۳ء

احمد وصّی کا پہلا شعری مجموعہ ''بہتا پانی'' ۱۹۸۳ء میں اور دوسرا ''جگنو میرے ساتھ ساتھ'' ۲۰۰۴ء میں شائع ہوا۔ کل ملا کر ۸۳ نظمیں ہیں۔ بچوں کے لیے لکھی گئی نظموں کے دو مجموعے ''تتلیاں'' ۲۰۰۷ء اور ''گلدان'' ۲۰۱۷ء میں شائع ہوئے۔ کربناک حالات پر ان کی نظمیں ''نئی کربلا''، ''بیسویں صدی''، اور ''جنریشن گیپ'' عمدہ ہیں جن کی تعریف سردار جعفری نے بھی کی ہے[۵]۔ احمد وصّی کے یہاں کہیں کہیں پر ہلکا احتجاج بھی ملتا ہے علاوہ ازیں وہ خواب وخیال اور آرزوؤں میں بھی الجھے نظر آتے ہیں۔

احمد وصّی نے جدیدیت کی کورانہ تقلید نہیں کی، اس رجحان کے زیر اثر انھوں نے ذات کے تاریک گوشوں میں ایک مدت تک خود کو محصور تو رکھا مگر منفی اور مریضانہ خیالات پیش کرنے سے گریز کیا۔ ان کے پہلے مجموعۂ کلام ''بہتا پانی'' کی ایک نظم ''بھیگا آنگن'' دیہات میں برسات کی ایک پر کیف رات کا رومانی منظر پیش کرتی ہے۔ وہ زیادہ تر اپنی نظموں میں شکستِ خواب اور ذات کی تاریکیوں میں بے قرار نظر آتے ہیں۔ نظم ''بیسویں صدی'' ایک ایسی مختصر نظم ہے جس کے چند مصرعوں میں پوری صدی کی کربنا کی کا عکس نظر آتا ہے:

چمک رہا ہے بدن میں عذاب کا سورج
ہوائیں زہر اگلتی ہوئی گزرتی ہیں
زمین بیٹھی ہوئی ہانپتی ہے منہ کھولے
یگوں یگوں کی تھکن ہے، چلا نہیں جاتا
تمام چھوٹے پرندے بڑوں کے چنگل میں
تڑپ رہے ہیں مگر مصلحت سمجھتے ہیں
اسی میں اپنے لیے عافیت سمجھتے ہیں

ہر ایک پیڑ کا پتی کا رنگ غائب ہے
نہ چاندنی نہ ستاروں کے پھول باقی ہیں
نہ آسماں ہے نہ اس کے اصول باقی ہیں
بہت دنوں سے زمانے کا حال بگڑا ہے
یہ لگ رہا ہے خدا جیسے بدلا بدلا ہے

احمد وصّی کے دوسرے شعری مجموعے ''جگنو میرے ساتھ ساتھ'' میں موضوع کا تنوع ملتا ہے۔ اس مجموعے میں شامل نظموں پر سے جدیدیت کا اثر زائل ہو گیا ہے۔ ان نظموں میں وہ اپنے گرد و پیش سے بھی باخبر نظر آتے ہیں۔ ''دنیا کتنی سمٹ گئی ہے'' یہ ان دوریوں پر ہے جسے کبھی خط کے ذریعے پُر کیا جاتا تھا، اب اکیسویں صدی کی ابتدا ہی سے سائنس اور ٹکنالوجی کی ترقیوں نے اس احساس کو ختم کر دیا۔ ''بمبئی کی لڑکیاں'' اور ''بڑی چھوٹی زندگی'' بمبئی کی تیز رفتار زندگی کا احساس دلاتی ہیں۔ نظم ''رقاصہ'' اور ''گیت کار'' میں ان دونوں پیشہ کے لوگوں کی ذات کا کرب پیش کیا گیا ہے۔ نظم ''انہدام''، ''لہولہو رشتے'' اور ''لہولہان'' ممبئی میں ۹۲۔۱۹۹۳ء کے فساد کے موضوع پر ہیں۔ ''چہرے''، ''آخری ملاقات''، ''گریز'' اور ''موڑ'' جیسی نظمیں عشقیہ موضوع پر ہیں۔ ''نقاب پوش'' باباؤں کے فریب پر طنزیہ نظم ہے۔ نظم ''ایک احتجاجی نظم'' میں سلمان رشدی پر بڑی سادگی سے احتجاج ہوا ہے۔ احمد وصّی کی نظموں میں تازگی کا احساس ہوتا ہے۔ نظم ''علامت'' میں فرقت کے جذبوں کا اظہار کتنی علامتوں سے آشکار ہے ملاحظہ فرمائیں:

جب آنسو خشک ہو جائیں
نگاہوں میں کسی تصویر کا سایہ نہیں کانپے
نہ پلکوں پر کبھی دن رات کا احساس لہرائے
نہ سانسوں میں کوئی جھونکا جھلس کر آگ برسائے
جہاں قدموں تلے بے نام دھرتی ہو
جو نہ جیتی، نہ مرتی ہو
جب اپنی شکل اپنے ہاتھ سے چھو کر نہ پہچانو

جب اپنی انگلیوں کو صرف اک بے جان شے جانو
سمجھ لینا کہ سب کچھ ختم ہے وہ موڑ آیا ہے
سمجھ لینا کہ میری یاد کے پت جھڑ کا موسم ہے

غرض کہ احمد وصی کی نظمیہ شاعری اپنے معاصر نظم نگاروں کے درمیان الگ شناخت رکھتی ہے۔

جاوید اختر، پیدائش: ۱۹۴۵ء

جاوید اختر فلمی دنیا سے وابستگی کے علاوہ اردو شعر و ادب میں بھی اپنی شناخت رکھتے ہیں۔ان کے دو شعری مجموعے، ''ترکش'' پہلی بار ۱۹۹۵ء میں منظر عام پر آیا اور اس کی دوسری اشاعت ۲۰۰۴ء کے ابتدائی ماہ میں ہوئی۔دوسرا شعری مجموعہ ''لاوا'' ۲۰۱۱ء میں شائع ہوا۔دونوں مجموعوں کو ملا کر کل ۴۶ نظمیں ہیں۔ان میں سے صرف ایک نظم ایک صفحے کی ہے باقی سبھی نظمیں بہت طویل نہیں تو مختصر بھی نہیں ہیں۔جاوید کی نظموں کی خاصیت یہ ہے کہ اس کی جڑیں روایت میں پیوست ہیں لیکن ان میں پھول پھل اور کونپلیں نئی فضا کا احساس دلاتی ہیں۔تعداد کے لحاظ سے یہ نظمیں بھلے ہی کم ہوں لیکن ایسا لگتا ہے کہ انھوں نے قاری پر اپنی تخلیقات کا بیجا بوجھ نہیں تھوپا ہے۔ہر نظم پر کشش ہے اور قاری کی فکر کو احساس کی وادیوں کی سیر میں شریک رکھتی ہے۔قرۃ العین حیدر نے انھیں مابعد جدیدیت کا شاعر کہا ہے[۶] جو درست معلوم ہوتا ہے۔اور آگے فرماتی ہیں:

> ''تازہ کاری، گہرائی اور تنوع، دیانتِ جذبات اور زندگی میں نئے مفاہیم کی تلاش ان کے اشعار کی خصوصیات ہیں۔''[۸]

مجموعہ ''ترکش'' کی تمام نظمیں ایک انتخاب معلوم ہوتی ہیں اور ان میں سے ''وہ کمرہ یاد آتا ہے''، ''بھوک''، ''ایک مہرے کا سفر''، ''مدر ٹھریسا''، ''فساد کے بعد''، ''الجھن''، ''شکست''، ''دشواری''، ''غم بکتے ہیں''، ''آؤ اور نہ سوچو''، ''وقت''، ''صبح کی گوری''، ''جرم اور سزا''، ''ہل اسٹیشن''، ''بے گھر''، ''زبان''، ''آنسو''، ''کائنات''، ''اعتراف''، ''خدا حافظ''، ''پرستار''، ''دل''، ''آرزو کے مسافر''، ''شبانہ''، ''کچی بستی'' اور ''ایک شاعر دوست سے'' ایسی نظمیں ہیں جو قاری کے ذہن و دل پر دیرپا اثر نقش کرتی ہیں۔

نظم ''شکست'' میں فتح و اقتدار کا نشہ اور اس کے عروج و زوال پر انسانی تاریخ کی ایک ایسی حقیقت کی طرف اشارہ ہے جس سے ہر ظالم و جابر مقتدر کا سابقہ پڑ چکا ہے پھر بھی درس عبرت کوئی نہیں لیتا۔پوری نظم کا تاثر صرف ان تین مصرعوں میں

سمٹ آیا ہے:

ہر ایک قصے کا اک اختتام ہوتا ہے
ہزار لکھ دے کوئی فتح ذرے ذرے پر
مگر شکست کا بھی اک مقام ہوتا ہے

نظم ''وقت'' برگساں کا فلسفۂ وقت جس کے بارے میں جاوید کو قرۃ العین ہی سے تجسس کی راہ ملی تھی۔ جس میں کائنات اور وقت کے مابین ایسے سوال اٹھائے گئے ہیں جن کا تشفی بخش جواب برگساں تو کیا سائنس بھی دینے سے قاصر ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی انھوں نے اس نظم میں ایک خیال اور شامل کر لیا جس کا اظہار امیر مینائی اور حالی بہت پہلے کر چکے ہیں۔ نمونہ دیکھیں:

نظم ''وقت''

یہ کائناتِ عظیم / لگتا ہے اپنی عظمت سے / آج بھی مطمئن نہیں ہے / کہ لمحہ لمحہ / وسیع تر
اور وسیع تر ہوتی جا رہی ہے

موضوع کے لحاظ سے جاوید کے یہاں تنوع ہے۔ ماضی سے وابستہ نظموں میں وہ یادیں ہیں جو بچپن سے جوانی تک اور ممبئی میں بے سروسامانی کی حالت میں گزاری ہوئی ابتدائی زندگی کی کسک رکھتی ہیں جس میں سے ''وہ کمرہ یاد آتا ہے''، ''بھوک''، ''بنجارہ'' اور ''بے گھر'' وغیرہ قابل مطالعہ ہیں۔ ''وقت'' اور ''کائنات'' تجسس سے بھرپور نظمیں ہیں۔ نظم ''خدا حافظ'' میں خدا سے خطاب ہوا ہے اور یہ خطاب روایتی انداز کا نہیں بلکہ خالص ہندوستانی قدیم تصور کے تحت خدا کی وحدانیت پر ہے۔ نظم ''پرستار'' میں یہ واضح کیا گیا ہے کہ کسی کا پرستار ہونا بھی ایک ذلت ہے جہاں اپنی انا کو کچلنا پڑتا ہے۔ ''عجیب قصہ ہے'' اور ''شبانہ'' عشقیہ نظمیں ہیں جن میں خیال کا بہاؤ دل سے اوپر کی سمت ذہن کی طرف پرواز کرتا ہے اور اظہارِ خیال کثافت سے پاک ہے۔ ''آرزو کے مسافر'' ان کی عمدہ نظموں میں سے ایک ہے۔ اس میں انسانی جبلت کو پیش کیا گیا ہے یعنی کوئی منزل آخری نہیں جب تک حیات ہے تلاش و جستجو کا سلسلہ جاری ہے۔ ''کچی بستی'' اس نظم میں ٹاٹ اور پھوس پر مشتمل غریب بستیوں کی زندگی کا بڑا ہی کربناک منظر پیش کیا گیا ہے۔ غرض کہ یہ موضوع نئے نہ سہی لیکن طرزِ اظہار سے تازگی کا احساس ہوتا ہے۔ گوپی چند نارنگ کے مطابق:

''....نظموں میں وہ (جاوید اختر) پارہ پارہ کر کے چلتے ہیں۔ کڑی در کڑی سوچتے ہوئے موضوع

کی شعری تشکیل میں درجہ بہ درجہ گہرائی میں جاتے ہوئے نظم کی تعمیر کرتے ہیں۔''۹

جاوید کی نظموں کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ سارے خیالات کا نچوڑ آخر میں اس طرح پیش کرتے ہیں کہ قاری کے ذہن میں اچانک روشنی کا جھماکہ ہو جائے۔

شفیق عباس، ۱۹۴۵ء تا ۲۰۱۱ء

شعری مجموعہ ''جزیرہ مری عافیت کا'' ۲۰۰۷ء میں شائع ہوا جس میں کل ۲۶ نظمیں ہیں۔ شفیق کے یہاں بھی چند عمدہ نظمیں ہیں جن میں سے نظم ''مجھے سوچنے دو'' میں انسان کے وجود اور مقصد زندگی پر غور و فکر ہے۔ ''سرشتِ ہوا'' ہوا کی فطرت پر عمدہ نظم ہے۔ نظم ''کینسر'' میں بتایا گیا ہے کہ ساری پریشانیوں کا اثر زائل ہو جاتا ہے اگر ایک ہم مزاج دوست مل جائے۔ اس نظم میں ہم مزاج دوست کی اہمیت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ نظم ''محرومی'' میں سچے دوست کی تلاش ہے۔ شفیق کے یہاں سنیچر کے دن کی بڑی اہمیت ہے جس کا ذکر شدت سے اپنی نظموں ''جزیرہ مری عافیت کا''، ''بازیافت'' اور ''سوچ کا پھل'' میں کیا ہے۔ نظم ''بازیافت'' میں نو سال پہلے کا اپنی زندگی سے جڑا کوئی اہم واقعہ پیش کرتے ہیں جس میں سنیچر کا دن اہم ہے لیکن اس مجموعے میں کہیں اس پر روشنی نہیں ڈالی ہے اور نہ ہی اس مجموعے کے مرتب، عبدالاحد سازؔ نے، اپنے مضمون ''عرض مرتب'' میں اس کا ذکر کیا ہے۔ نظم ''تم آ گئے تو''، کسی کی آمد پر سکونِ قلب کا اظہار ہے۔ نظم ''سراسیمگی'' شہر کے فساد اور دہشت زدہ ماحول کو پیش کرتی ہے۔ نظم ''انجام'' شفیق کی عمدہ نظموں میں سے ایک ہے جس میں خواہشوں کا انجام پیش کیا گیا ہے۔ نمونہ دیکھیں:

میری خواہش / انتہا سے پرے / لامکاں سے ادھر / جانے کیا کچھ.....مگر

بس میں میرے / جو دیکھا تو کچھ بھی نہیں تھا

علاوہ ازیں دو تاثراتی نظمیں بھی ان کے یہاں ملتی ہیں۔ عشقیہ نظمیں بھی ایک دو ہیں، لیکن شفیق کی نظموں پر مجموعی نظر ڈالی جائے تو یاس و حرماں اور محرومی کا گہرا سایہ نظر آتا ہے اور عبدالاحد سازؔ کے الفاظ میں ''انسانی رشتوں کی جذباتی و نفسیاتی پیچیدگیاں'' ۷ کے اظہار میں شدت محسوس ہوتی ہے۔

عبداللہ کمال، ۱۹۴۸ء تا ۲۰۱۰ء

ان کے شعری مجموعے ''میں'' ۱۹۷۷ء، ''بے آسماں'' (غزلوں کا مجموعہ) ۱۹۹۷ء اور ''شب کی دیوار میں روزن'' ہیں۔

آخری الذکر مجموعہ دستیاب نہ ہوسکا۔ ''میں'' میں کل ۱۳ر نظمیں ہیں۔ عبداللہ کمال کی نظمیں اکثر مختلف رسائل کی زینت بنتی رہی ہیں۔ جدیدیت اور مابعد جدیدت کے شاعروں میں ان کا ذکر نقاد حضرات کرتے رہے ہیں۔ نظم ''نقابوں کا شہر'' میں نقادانِ ادب پر چوٹ کی گئی ہے جس میں، ناؤ، مسافر، طوفان اور سفر کی مدد سے ایک عجیب شہر کے واقعے کو افسانوی ڈھنگ سے پیش کیا گیا ہے۔ نظم ''میں'' میں خوش فہمی کا انجام مذکور ہے۔ نظم ''اگر اک لمحۂ خالی میسر ہو'' میں جنسی ربط و تعلق پر اشاروں میں انسانی تاریخ کا حوالہ دیتے ہوئے منطقیانہ اظہار ہوا ہے۔ نمونہ دیکھیں:

طلب اک جسم کی لذت سے اخلاقاً بندھی ہوتی ہے، ورنہ
طلب اک جسم کی لذت سے آسودہ نہیں ہوتی

نظم ''لامنظریت کے بعد'' ذات کے حصار سے باہر نکلنے کے موضوع پر ہے۔ غرض عبداللہ کمال کی نظموں میں فکر کی گہرائی تو ہے مگر بے جا اشاروں سے ایک الجھن سی محسوس ہوتی ہے جسے وہ افسانوی انداز کے ذریعے دور کرنے کی کوشش میں ناکام نظر آتے ہیں۔

جاوید ناصر، ۱۹۴۹ء تا ۲۰۰۶ء

شعری مجموعے ''حاصل'' ۱۹۷۷ء، ''تلافی'' ۱۹۸۳ء اور ''تازیانہ'' ۲۰۰۶ء، ہیں۔ ان میں سے صرف آخر الذکر دستیاب ہوسکا جس میں کل ۸۰ر نظمیں ہیں۔ ابتدائی کچھ تاثراتی نظمیں جو اپنے والد، قاضی سلیم، اپنی بیٹی سیماب، اپنی بیوی اور اپنی ماں کے لیے کہی ہیں۔ علاوہ ازیں جاوید ناصر کی نظموں کا موضوع ان ہی کی ذات سے منسلک ہے۔ وہ اپنی مختلف کیفیتوں کو نظموں کی شکل دیتے ہیں جس میں نفسیاتی عنصر زیادہ ہیں اور ان سب کے اظہار میں اساطیری کردار کا بھی سہارا لیتے ہیں۔ ان کی زیادہ تر نظمیں ایسی ہیں جن میں لفظوں کا لغوی معانی سے دور کا بھی واسطہ نظر نہیں آتا۔ ان کی نظموں کے تعلق سے باقر مہدی کا یہ قول اہم ہے:

> ''جاوید ناصر کی نظمیں نفسیاتی نظمیں ہیں، ادھوری یادداشتیں، خوابوں میں دیکھے ہوئے دیوزاد پیکر، کابوسی وحدتیں۔ اسطیری کردار..... یہ سب چیزیں ایک وحشی، پراسرار اور منھ زور قوت کے طور پر نظموں میں سر اٹھاتی ہیں، ان نظموں کا باہر کی دنیا سے کوئی تعلق نہیں، اطراف و اکناف سے کوئی علاقہ نہیں، جاوید ناصر کے وجود میں جو دنیا آباد ہے بس اسی سے سروکار ہے۔ یہاں

جاوید تہذیب وشائستگی کے لبادے کو اتار کر اپنی جبلت کو پہن لیتا ہے۔ اور نظموں میں سمت کا تعین کیے بغیر گھومتا پھرتا ہے۔ غم، غصہ، وحشت، سنک، تناؤ اور جنسی وفور بھرپور تخلیقی قوت میں تبدیل ہوجاتا ہے۔''[۱۰]

باقر مہدی کا یہ قول جاوید ناصر کی نظموں پر اتنا جامع ہے کہ مزید کہنے کی گنجائش نہیں رہ جاتی۔ جن نظموں کے پیش نظر یہ بات صادق آتی ہے ان میں ''حاصل''، ''بھنور''، ''اظہار''، ''سب کچھ وہی ہے'' اور ''نجات'' وغیرہ جیسی کئی نظمیں ہیں جو قاری کی فکر کو الجھا دیتی ہیں۔ علاوہ ازیں جاوید ناصر کے یہاں کچھ مختصر نظمیں ہیں جو واضح ہیں اور قاری کو متاثر بھی کرتی ہیں، ان میں ''وحدت''، ''محاصرہ''، ''وسوسہ''، ''شناسائی'' اور ''آگہی'' وغیرہ قابل ذکر ہیں، مثال دیکھیں:

نظم ''شناسائی''

جانے کیا بات ہے کہ مندر سے / رات، صدیوں کے بعد آئی ہے / چاروں کمروں میں
مسکراتی ہے / گھر کے حمام میں نہاتی ہے / میرے کپڑے پہن کے جاتی ہے / اور پھر لوٹ
کر بھی آتی ہے / صبح، / اب پوچھتی ہے.....ناصر جی / اس کو رخصت کرو تو بہتر ہے

نظم ''آگہی''

مدتوں بعد، / تیری یاد آئی / رات نیندوں کو تھپکیاں دے کر / تیری تصویر میں، / نظر آئی، /
میں نے سمجھا بجھا کے روک لیا / خودکشی کر رہی تھی بینائی

ناصر کی ایسی نظموں میں مفہوم بھی واضح ہے اور الفاظ اپنے لغوی یا مرادی معنی سے قریب بھی ہیں، ورنہ ان کی نظموں کا بیشتر حصہ عام قاری کے لیے کسی معمہ سے کم نہیں۔

عبدالاحد ساز، ۱۹۵۰ء تا ۲۰۲۰ء

عبدالاحد ساز کے اب تک تین شعری مجموعے منظر عام پر آ چکے ہیں۔ ''خموشی بول اٹھی ہے'' ۱۹۹۰ء، ''سرگوشیاں زمانوں کی'' ۲۰۰۳ء، اور ''در کھلے پچھلے پہر'' ۲۰۱۷ء۔ تینوں مجموعوں کو ملا کر ۱۱۸ نظمیں ہیں۔ ساز کے تعلق سے ندا فاضلی کا یہ قول ساز کے پہلے اور دوسرے شعری مجموعے کے ضمن میں ہوگا کہ:

''ساز کی اکثر شعری ترجیحات میرے مطالبات پر پوری نہیں اترتیں وہ اپنے کلام میں موجود

ضرور ہیں مگر انہیں تلاش کرنا پڑتا ہے۔ میں ان کے اندر کے شاعر کے کھل کر باہر آنے کی توقع رکھتا ہوں۔''[۱۱]

لیکن تیسرے شعری مجموعے میں ساؔز کی موجودگی کا احساس ہوتا ہے۔ ساؔز اپنی نظمیہ شاعری کیتعلق سے ایک شناخت رکھتے ہیں۔ ان کی نظم ''سوالِ روزِ محشر'' ایک اہم نظم ہے جس میں تمام شعبۂ حیات میں، بربریت، ظلم و جبر، ریاکاری اور فتنہ پروری سے ہونے والی تباہ کاری پر جہاں انسان سوچتا ہے کہ خدا ہے بھی یا نہیں ایسے وقت میں ساؔز، زمین پر پھیلے سارے خلفشار کا ذمہ دار انسان کو مانتے ہیں۔ نظم ''فرقہ پرستوں کے نام'' ہندوستانی ماحول میں ہمیشہ تروتازہ محسوس ہوگی اس میں فرقہ پرستوں کو مخاطب کر کے کہتے ہیں:

تم ظلم کیے جاؤ، پہ یہ جان لو کل ہم ؍جو بامِ شواہد سے کسا جائے گا تم پر ؍تم پھوٹ کے پھیلو گے،
مگر کوڑھ کی صورت ؍خود تم جسے بھگتو گے، وہ خمیازہ رہیں گے ؍ہم نطقِ حقیقت کا وہ آوازہ
رہیں گے ؍ہم زخم کی مانند تروتازہ رہیں گے

نظم ''آخری پیام'' یکجہتی کی عمدہ مثال ہے جس میں فکر و عمل کا دخل زیادہ ہے۔ دراصل یہ نظم ایک پیغام ہے ہندوستانی عوام کے لیے۔ شہر آشوب کی طرز پر ان کی نظم ''ادب آشوب'' موضوع کے اعتبار سے نئی نہیں لیکن اظہار میں تازگی محسوس ہوتی ہے۔ نظم ''مدافعت''، ''قوسِ قزح''، ''چوائس''، ''صفر''، ''ابلاغ'' اور ''ہم آہنگ'' جیسی کئی نظمیں ہیں جن کا مفہوم غیر واضح ہے اور متکلم حاضر و غائب کا بھی اندازہ نہیں ہو پاتا شاید ساؔز کی ایسی ہی نظموں کے لیے ندؔا فاضلی نے مذکورہ بالا بات کہی ہوگی۔

ساؔز کی ان نظموں کے مطالعے سے ندؔا فاضلی کے قول کی تصدیق تو ہوتی ہے مگر ساتھ ہی ساؔز کی چند نظموں کا اسلوب ابن صفؔی کی طرح ہے جس کا مفہوم ایک دو نظموں کے مطالعے سے قاری پر واضح نہیں ہوتا۔ تاثراتی نظموں میں ''نانی اماں کی وفات پر ایک نظم''، ''اے دیارِ دلی''، ''جملۂ تسلیم''، ''آواز کے موتی''، ''فیض احمد فیض کی وفات پر''، ''اے خسروِ شیریں سخنا!''، ''ندا فاضلی کی پورٹریٹ''، ''گاہ دیواروں کے باہر، گاہ دیواروں کے بیچ''، ''دیواروں کے بیچ''، ''کالی داس گپتا رضؔا کی وفات پر'' اور ''فضائیں اس کی یادوں کی'' وغیرہ ایسی تاثراتی نظمیں ہیں کہ اگر ۱۹۶۰ء کے بعد کی اردو تاثراتی نظموں کا انتخاب شائع کیا جائے تو ساؔز کی یہ نظمیں اس میں شامل کی جاسکتی ہیں۔ ساؔز کے یہاں موضوع کا تنوع ہے۔ عشقیہ کیفیت کے اظہار میں ''دل دہی''، ''حسنِ تعلق'' اور ''خلوت کدہ'' نظمیں ایسی ہیں جہاں ساؔز بقول ندؔا فاضلی ''وہ اپنے میں موجود ضرور ہیں مگر انھیں تلاش کرنا

پڑتا ہے'' مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ ساؔز کے یہاں ایسے موضوع پر نا آسودگی کا رونا نہیں ہے اور نہ ہی آسودگی کا بے باک اظہار ہے۔ ''چلو اب لوٹ جائیں''، ''ترجیح''، ''تقلیل'' اور ''معمول'' بھی ان کی عمدہ نظمیں ہیں۔ نظم ''معمول'' کا نمونہ دیکھیں:

میری موت / جھیل میں پھینکے جانے والے کنکر جیسی ہی تو ہوگی / کچھ یاروں پیاروں کے دلوں میں / ہوک کی لہر ابھرتی ہے / کچھ لمحوں کو غم کے دائرے پھیلتے ہیں / پھر پانی، پانی سے مل جاتا ہے / دائمی فرقت کا ہر زخم / چار دنوں میں سل جاتا ہے۔

عبدالاحد ساؔز مہاراشٹر کے ان شعرا میں شمار کیے جاتے ہیں جن سے اردو نظم کی اور بھی توقع وابستہ ہیں۔

مذکورہ بالا نظم نگاروں کی نظمیہ شاعری اپنے عہد کی آئینہ دار بھی ہیں اور قدیم وجدید طرزِ فکر کی عکاس بھی۔ یہ وہ نظم نگار ہیں جو اپنی طرزِ خاص کی بنا پر اردو دنیا میں اپنی الگ شناخت بنا چکے ہیں۔ مہاراشٹر کے ہم عصر نظم نگاروں میں مزید ناموں کی گنجائش ہوسکتی ہے۔ لیکن طوالت کے مدنظر انھیں پر اکتفا کیا جارہا ہے۔

○○○

حوالہ جات:

۱۔ تکمیل، سہ ماہی، بھیونڈی۔ گوشۂ قاضی سلیم۔ شمارہ اپریل تا جون ۲۰۰۵ء۔ صفحہ ۱۳۹

۲۔ تکمیل، سہ ماہی، بھیونڈی۔ گوشۂ قاضی سلیم۔ شمارہ اپریل تا جون ۲۰۰۵ء۔ صفحہ ۱۰۰

۳۔ باقیاتِ باقر مہدی۔ مرتب: یعقوب راہؔی۔ اشاعت ۲۰۰۸ء، ص ۳۷۲

۴۔ محمد حسین۔ ''شفیق فاطمہ شعرا اور گلۂ صفورہ''۔ اشاعت: ۲۰۱۷ء۔ ناشر: دارالاشاعتِ مصطفائی۔ دہلی۔ ص ۶۱

۵۔ وحید اختر۔ آئینہ در آئینہ، ص ۱۵

۶۔ سہ ماہی، شناخت، ممبئی۔ ظفؔر گورکھپوری نمبر۔ اشاعت: ۲۰۱۳ء۔ ص ۱۳۱

۷۔ ''نئی گھٹائیں اتر رہی ہیں''، رفیعہ شبنؔم عابدی۔ اشاعت: ۲۰۱۰ء

۸۔ دیباچہ، ترکش، ص ۱۵۔ اشاعت دوم، جنوری ۲۰۰۴ء

۹۔ لاوا۔ جاوید اختر کی شاعری۔ گوپی چند نارنگ۔ ۲۰۱۱ء۔ ص ۱۶

۱۰۔ ماہنامہ، جواز۔ شمارہ نمبر ۳۹۔ گوشۂ جاوید جاصر۔ مشمولہ: تازیانہ، ص ۹۳

۱۱۔'اظہار خیال' سے اقتباس، ندا فاضلی ۔مشمولہ: سہ ماہی، ترسیل ۔ممبئی۔ تیسرا شمارہ۔ جلد اول۔ سنہ ندارد

ماخذات:

۱۔ص ۸۔ نظم سمندر۔ مرتب: عبداللہ کمال، ۱۹۹۶ء

۲۔ص ۱۴۔ رنگِ حنا۔ اشاعت: ۱۹۶۴ء

۳۔ص ۴۹۔ حنا بن گئی غزل۔ اشاعت: ۲۰۰۳ء

۴۔ص ۱۴۵۔ تریاق، ممبئی، رفیعہ شبنم عابدی نمبر۔ جون ۲۰۱۷ء

۵۔ص ۱۷۔ احمد وصی: شاعری اور شخصیت۔ مرتب: ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی۔ اشاعت: ۲۰۱۰ء

۶۔ص ۱۵۔ ترکش۔ اشاعت: ۲۰۰۴ء

۷۔ص ۵۔ جزیرہ مری عافیت کا۔ اشاعت: ۲۰۰۷ء

○○○

رابطہ:

ڈاکٹر شیخ احرار احمد

شعبۂ اردو، رناڈی بھوان، اے۔ ونگ

ممبئی یونیورسٹی، مہاراشٹرا

فون: 7498088534 +91

ای میل: ahrarazmi1978@gmail.com